انسان ابلیس یا فرشتہ: منٹو کا زاویۂ نگاہ

ڈاکٹر روبینہ یاسمین

Dr. Rubina Yasmeen

Govt. Post Graduate College, Sargodha.

ڈاکٹر ہارون قادر

Dr. Haroon Qadir

Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

The article under review encompasses two extreme dimensions of human psyche; his cherubic and satanic instincts, depicted by Manto in his short stories. It is analyzed in the backdrop of certain characters from his stories that man is prone to oscillate between these two extremes and may turn at any moment towards any one of these dimensions. This capacity to be an angel or vice versa is innate in his nature. However, he can't be coined as an angel or a devil exclusively but presents an intricate blend of both extremes in his unpredictable existence.

مذاہب عالم میں جہاں انسانی عظمت کا تصور ہے، انسان کا ارفع مقام ہے وہیں ابلیس کا ذکر بھی ساتھ ہے کیونکہ انسان اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری، بلکہ گیلی مٹی سے ڈھلا ہوا مجسم ہے۔ شیطان نے انسان کو سجدہ کرنے اور اُس کی فضیلت سے انکار کے لیے یہی جواز پیش کیا تھا کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے، لہٰذا میں اس سے برتر ہوں۔ فرشتے بھی لرزاں تھے کہ یہ مخلوق زمین پر فساد کرے گی لیکن حکمِ خداوندی کے سامنے خاموش تھے کہ جو خدا جانتا تھا وہ نہیں جانتے۔ مگر ابلیس کے انکار نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔ ملکوتیت اور شیطنیت کے درمیان انسان ایک دیوار ہے۔ نہ وہ نوری ہے نہ ناری۔ بقول سجاد انصاری ''انسان صرف اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ ملکوتیت اور شیطنیت دونوں کو ایک دوسرے سے براہِ راست ٹکرانے نہ دے اور جب کبھی تصادم کا اندیشہ ہو، اپنی ہستی کو پیش کر دیا کرے۔''(۱)

انسان کبھی تو فرشتوں کی طرح پاکباز، معصوم نظر آتا ہے جن میں نافرمانی کی صفت ہی نہیں جو فرماں بردار اور اطاعت گزار ہیں، مگر جرأتِ گناہ کرتا ہے تو شیطان کی طرح تکبر کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ کبھی فرعون بن کر خود کو سجدہ کرواتا ہے تو کبھی شداد بن کر جنت کی تعمیر کا بیڑا اُٹھا لیتا ہے۔ کبھی تو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی پاتال کی گہرائیوں کو چھو کر انسانیت کو شرمندہ کر دیتا ہے۔ انسان کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی کرنا مشکل ہے کہ یہ گیلی مٹی کب، کیا روپ ڈھال لے۔ انسان کا ہر روپ

انوکھا اور نرالا ہے کبھی بظاہر فرشتہ مگر باطن شیطان کو بھی شرما دیتا ہے تو کبھی ظاہری بدصورتی کے اندر ہی سے انسانیت پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتی ہے گویا بدلی سے چاند نکلنے کا منظر سامنے آجاتا ہے۔منٹو نے اسی انسان کے مختلف روپ اپنے افسانوں میں دکھائے ہیں۔منٹو کے افسانوں میں جنس ایک صحت مند جذبے کے طور پر سامنے آتی ہے مگر یہی جنسی جذبہ جب انتہا کو چھو لیتا ہے تو معاشرے میں رشتوں کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔محرماتی عشق بھی اسی منہ زور جذبے کا خطرناک روپ ہے۔افسانہ ''اللہ دتا''(۲) کی بیوی اور اُس کا داماد (زینب کا شوہر) فساداتِ تقسیم میں مارے جاتے ہیں۔پاکستان آ کر اللہ دتا اور زینب، باپ اور بیٹی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے جنسی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میاں بیوی کی سی زندگی گزار رہے ہیں مگر کسی کو علم نہیں۔اللہ دتا کا بیٹا طفیل صبح گھر سے کام پر چلا جاتا ہے۔زینب باپ سے لپٹ لپٹ جاتی ہے اُسے چومتی ہے جب کہ زینب کی چچازاد صغریٰ اپنے باپ سے محبت تو کرتی ہے مگر احترام کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔مسئلہ اُس وقت سامنے آتا ہے جب صغریٰ طفیل کی بیوی بن کر اللہ دتا کے گھر قدم رکھتی ہے اور اس خوفناک حقیقت سے آگاہ ہو جاتی ہے مگر اپنا منہ بند رکھتی ہے۔اللہ دتا شیطان کا دوسرا روپ ہے۔بیٹی سے بیوی کے تعلقات کے بعد گھر میں بہو پر بھی بُری نظر رکھتا ہے اور ایک دن موقع پا کر اُسے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔صغری کوشش کر کے اُس کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی عزت تو بچا لیتی ہے مگر اپنا گھر نہیں بچا سکتی یہاں زینب ایک سوتن کا کردار ادا کرتی ہے۔اُس مقدس رشتے سے ہٹ کر صغری کو اپنا مدمقابل محسوس کرتی ہے اور بھائی سے کہہ کر اُسے طلاق دلوا دیتی ہے۔جب کہ باپ جس سے اب اُس کا خاوند کا رشتہ ہے کے سامنے آگ بگولا بن کر کہتی ہے:

''کیا ایک کافی نہیں تھی تمہیں تو شرم نہ آئی پر اب تو آ جانی چاہیے مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا
اسی لیے میں اس شادی کے خلاف تھی۔اب سن لو،صغری اس گھر میں نہیں رہے گی،کیوں؟
زینب نے کھلے طور پر کہا،میں اس گھر میں اپنی سوتن نہیں دیکھنا چاہتی۔''(۳)

مرد اور عورت دونوں کی فطرت ازل سے ایک ہی ہے۔اللہ دتا مرد ہے،عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اُس کی سرشت ہے۔اُس شیطان صفت نے باپ بیٹی کے رشتے کو میاں بیوی کے رشتے میں ڈھال لیا۔زینب بھی اُسی باپ کی بیٹی ہے اب وہ اس ناجائز رشتے میں کسی اور کی شراکت برداشت نہیں کرنا چاہتی۔وہ عورت ہے اور سوتن نہیں چاہتی۔''مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا'' کہہ کر منٹو نے ایک جملے میں سارے افسانے کا نچوڑ سمو دیا ہے کہ گناہ ایک دلدل ہے اور انسان اُس میں گر کر اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے،کوئی خلش،کوئی پچھتاوا نہیں،بیوی کی وفات،دوسری شادی نہ کرنا،واقعات کا تانا بانا اس طرح جڑتا ہے کہ انسان کے اندر کا شیطان باہر آجاتا ہے اور باپ بیٹی کا مقدس رشتہ اس طرح مجروح ہوتا ہے کہ اُسے کوئی نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔اچھائی،بُرائی یا نیکی اور بدی کا کوئی تصور ہی نہیں۔مجوزہ اخلاقی نظام سے ہٹ کر صرف اور صرف انسانی فطرت شیطانی فطرت میں ڈھل کر شیطانی کھیل اس طرح کھیلتی ہے کہ شیطان بھی شرما جائے۔آدم کی جرأت گناہ،شیطان کو بھی مات دے دیتی ہے کہ یہ بھی انسان ہی کا ایک روپ ہے۔منٹو کے ہاں کئی کردار ایسے ہیں جو شیطان کا ہی دوسرا روپ ہیں جن میں انسان کا صرف بہروپ ہے ورنہ اُن کے کردار ہر لحاظ سے شیطانی ہیں۔منٹو نے ان کرداروں کو تراشنے میں جس سماجی حقیقت نگاری کو برتا ہے اُس کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔اُس کے تمام موضوعات اسی محور کے
گرد گھومتے ہیں۔منٹو اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔اُس کے یہاں

انسان اور انسانیت کی تکمیل کا جذبہ کارفرما ہے۔ البتہ اُس کے روپ مختلف ہیں۔ کہیں انسانیت کا سدھار ہے، کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں رشتوں کی ضرورت کا خیال ہے، کہیں انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کہیں خامیاں، کہیں اس کی بے راہ روی ہے تو کہیں بدعنوانی ہے، کہیں اس کی بے حسی ہے مجبوری ہے غرض انسانی زندگی کے اَن گنت روپ منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں۔" (۴)

"ممی" منٹو کی ایک اور نادر تخلیق "ممی" (۵) کا کردار ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو نے جو جاندار کردار تخلیق کیے اُن کرداروں کے افسانے کرداری ہیں یعنی تمام افسانہ ایک ہی کردار کے گرد گھومتا ہے اور منٹو اُس کردار کے نام افسانے کو معنون کر دیتا ہے۔ جانکی، شاردا، ممی، موذیل یا پھر گوپی ناتھ، انھی کرداروں میں شمار ہوتے ہیں جو افسانوں کے عنوان ہو کر امر ہو گئے۔

"ممی" بظاہر فاحشہ ہے دلالّہ ہے مگر وہ اپنے جاننے والے، محبت کرنے والوں کے لیے ممی ہے۔ اُس میں ماں کی سی شفقت ہے گو اُس شفقت کا انداز بھونڈا اور محبت کا اظہار بے قرینہ سا ہے مگر وہ اپنے منہ بولے بیٹے چڈے کو ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چڈہ فی لس نامی لڑکی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا رات گذارنے کے لیے ممی اُس لڑکی کے لیے ڈھال بن گئی کہ اتنی کم عمری میں اُسے جنسی آلودگی سے بچانا ضروری تھا۔ چڈہ باز آنے والا نہ تھا شراب اور شباب دونوں مل کر اُس کے حواس پر چھا چکے تھے۔ ممی کی التجا پر وہ نشے میں دھت ممی کو گالیاں دیتا ہے، ممی گالیاں سن لیتی ہے فی لس کے لیے مگر چڈہ زور زبردستی پر اُتر آتا ہے تو ممی چڈے کے منہ پر زوردار چانٹا جڑ دیتی ہے۔ چڈہ غصے میں باہر چلا جاتا ہے یوں ممی فاحشہ اور دلالہ ہونے کے باوجود ایک لڑکی کو ایک بھیڑیے سے بچا لیتی ہے۔ پولیس ممی کو پونے سے دربدر کر دیتی ہے کہ وہ قحبہ ہے، دلالہ ہے، غلاظت ہے، مگر چڈہ کے منہ سے صرف ایک جملے میں ممی کا کردار سامنے آجاتا ہے کہ "منٹو اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اُس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھوڈالا۔" (۶)

چڈے کا کردار بھی منٹو کا دیکھا بھالا کردار ہے۔ یہ ہر چند چڈہ ہے جو رند، بلانوش اور گالیاں دینے کا ماہر تھا۔ اُس کی خرمستی کا رنگ ادبی تھا۔ جلد یا بدیر چڈہ کی انسانیت جاگ گئی اور اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اس احساس کے پیچھے ممی کی شفقت بھری مار تھی جس نے اُس کے اندر کے انسان کو بیدار کر دیا، ورنہ تو چڈہ ہوش و حواش میں نہ تھا۔

انسان انسان کے روپ میں کم اور اپنی دونوں انتہاؤں یعنی فرشتہ اور شیطان کے روپ میں زیادہ نظر آتا ہے کہ انسان فطرتاً انتہا پسند ہے۔ کبھی فرشتہ نظر آنے لگتا ہے تو کبھی شیطان بن جاتا ہے مگر اس کا یا کلپ میں اُس کا نہیں اُس کے ماحول کا، خاصیت کا اثر ہے کہ دوسروں کے دھوکے اور فریب، اُن کے چالیں انسان کو زود رنج بنا دیتی ہیں اور انسان کے شعور اور تحت الشعور میں ایک جنگ چھڑ جاتی ہے۔ انسان اپنے دل کو پتھر کا بنا لیتا ہے یا پھر مزید دھوکے کھانے کے لیے محبت جاری رکھتا ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں بے وقوف بنتا ہے، جانتے بوجھتے ہوئے دوسروں کی چالبازیاں سمجھتے ہوئے اُن کی دوستی نبھاتا ہے، یہ انسان فرشتہ کا دوسرا روپ ہے۔ یہ راہب ہے، یہی بابو گوپی ناتھ ہے جو رند ہوتے ہوئے بھی فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں لٹنے سے اُسے مزہ آتا ہے۔ وہ جانتے بوجھتے بے وقوف بنتا ہے کہ اس نے انسانی ذات کے نہاں خانے سے اپنے وجود کو، اپنے ہونے کو دریافت کر لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ اور ممی کے کردار عام افسانوی کردار نہیں، یہ منٹو کے خونِ جگر سے نمو پانے والے کردار ہیں۔ ابوسعید قریشی لکھتے ہیں:

> ''بابو گوپی ناتھ اورممّی'' کی مورتیوں میں مجھے آدم وحوّا کا عکس نظر آتا ہے۔ان کا گناہ آدم و حوّا کا گناہ ہے لیکن ان کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں ۔منٹو ہمیں یاددلاتا ہے کہ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بارِعصیاں کے باوجود انسان ہے۔''(۷)

بابو گوپی ناتھ ایک چھٹا ہوارند ہے۔مالدار اورعیاش ہے۔اُس کا ماضی عیش پرستی کی داستان ہے۔شہر کے بڑے سے بڑے کوٹھے پراُس کا گذر رہا ہے۔گناہ وثواب کے فلسفے سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ قحبہ خانوں کا راہب ہے۔ جہاں انسان اپنی ذات کی شناخت کھو دیتا ہے، جہاں صرف دھوکا ہی دھوکا ہے۔مگر بابو کا زندگی کا فلسفہ نرالا ہے اُس نے تمام عمر دھوکے اور فریب کی دنیا میں بسیرا کیا ہے کہ اب اُسے کسی اورطرز کی زندگی کی طلب نہیں۔عبدالرحیم سینڈومنٹو سے بابو گوپی ناتھ کو یوں متعارف کرواتا ہے:

> ''آپ ہیں بابو گوپی ناتھ، بڑے خانہ خراب لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔بابو گوپی ناتھ مسکرایا(سینڈو نے کہا)۔کوئی نمبر ون بے وقوف ہوسکتا ہے تو وہ آپ ہیں لوگ ان کے مسکا لگا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔''(۸)

وہ اسی فریب زدہ ماحول کی تلاش میں ہے جہاں ڈھلتی جوانی کے بعد اپنا بڑھاپا گزار سکے۔منٹو کا یہ انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے، دھوکہ کھاتا ہے مگر دھوکا دیتا نہیں، بے وقوف بنتا ہے مگر بناتا نہیں۔وہ منٹو سے کہتا ہے:

> ''میں نے آج تک کسی کا مشورہ رَدنہیں کیا۔جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں لیکن میں اُنھیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لیے کہ اُن میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے اُن کا اُلو سیدھا ہوسکتا ہے۔''(۹)

بابو گوپی ناتھ نے زندگی عیش وعشرت میں گزاری، بے تحاشا دولت باپ سے ورثے میں ملی، اُس کی تمام عمر فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں گزری ہے۔ یہ بھی بابو جی کی زندگی کا اہم تضاد ہے کہ فقیر کا تکیہ اور رنڈی کا کوٹھا بظاہر دو مختلف اور متضاد جگہیں ہیں مگر بابو گوپی ناتھ کو دونوں سے محبت ہے وہ ان جگہوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ تماش بین ہے اُسے دولت لٹانے میں لطف آتا ہے۔دھوکہ کھانے میں مزہ آتا ہے چوں کہ ان دونوں جگہوں پر دولت لٹانے کا بھی موقع ہے اور دھوکا کھانے کا بھی لہٰذا یہ دونوں جگہیں اُس کی دل پسند ہیں۔ وجہ وہی انسان کی فطرت کہ وہ ان دونوں جگہوں کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ اپنا بڑھاپا یعنی دولت ختم ہونے کے بعد کی زندگی بھی یہیں گزارنا چاہتا ہے۔اُس کی عمر ڈھل رہی ہے مگر وہ انھی جگہوں، انھی لوگوں میں خوش ہے۔ توبہ کا اُس کے یہاں کوئی تصور نہیں کیونکہ توبہ کا تصور گناہ اور ثواب سے جڑا ہے فائدے اور نقصان سے اُس کے ڈانڈے جا ملتے ہیں مگر بابو جی نفع نقصان اور فائدے کی منزل سے بہت آگے ہیں وہ گیان کی اس منزل پر ہیں جو کسی صوفی کو عرصے بعد ملتی ہے مگر بابو نے اُس منزل کو کسی ایک لمحے میں، اُس روشنی کی کرن کو پا لیا ہے جسے معرفت کہتے ہیں۔مگر انداز رندانہ ہے کہ انھیں نیکی، اچھائی کی شہرت سے غرض نہیں اور خود بھی اس گیان سے ناواقف ہیں کہ جو اُن کی زندگی کی کایا کلپ کر چکا ہے۔

اب دولت ختم ہونے والی ہےاور عمر ڈھلتی ہوئی ہے کہ طوائف کے کوٹھے کو بھرنا تو کسی بھی سیٹھ کے بس کا روگ نہیں مگر ابھی بابو گوپی ناتھ میں دم ہے اُسے اپنی فکر نہیں اپنی پسندیدہ عورت یا لڑکی زینت کی فکر کھائے جاتی ہے کہ وہ کم عمر اور معصوم ہے اُس کا کیا بنے گا۔ وہ پانچ دن کے پروفیسر کی طرح اُس کی معصومیت کا فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اُسے زینو سے واقعی محبت ہے۔ وہ اُسے داشتہ بنا کر رکھنے کی بجائے اُس کے لیے کوئی مالدار آدمی ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اُس کی دلی آرزو ہے کہ ''زینت بمبئی میں کسی مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرنے میں کامیاب ہو جائے۔''(۱۰)

زینت سوچتی ہے کہ بابو کی بےعزتی ہوگی کہ ایک عورت کو خود نہیں رکھ سکتا۔ وہ اپنی پسندیدہ عورت سے پیشہ کروانا چاہتا ہے مگر بابو کو تو اُس کے مستقبل کی فکر ہے کہ اُس کے بعد زینو کا کام کیسے چلے گا۔ وہ اُسے اپنے پیشے میں اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں پھر بابو گوپی ناتھ کی شخصیت کا تضاد سامنے آتا ہے کہ کہاں وہ زینت کو حاصل کرنے کے لیے دو ماہ تک پولیس اور مقدمے کا سامنا کرتا رہا اور اب وہ خود اُسے دوسروں کے ہاتھ دینا چاہتا تھا کہ کل کو اُسے تکلیف نہ ہو۔ وارث علوی نے بابو گوپی ناتھ کے کردار کی بہت خوبصورت ترجمانی یوں کی ہے:

> ''بابو گوپی ناتھ غزل کا وہ عاشق ہے جو شب غیر کاٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اُس میں نہ گراوٹ پیدا ہوتی ہے نہ طہارت۔ وہ طوائف کے عورت پن اور اُس کی انسانیت کو سمجھتا ہے۔''(۱۱)

بابو کی دولت ختم ہو جائے گی تو طوائف کا خرچہ کون اٹھائے گا، داشتہ کون رکھے گا کہ پیٹ اور ضروریات کا منہ تو کھلا رہتا ہے۔ عام طور پر تماش بین طوائف کے لیے آپس میں قتل و غارت تک آجاتے ہیں مگر بابو کے گیان نے اُس کی شخصیت کا دوسرا رُخ سامنے کر دیا ہے۔ چمکدار سکے جیسا، کھوٹی دنیا کے باسی کا کھرا روپ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم انسان کے باطن کی اچھائی پر ایمان لے آتے ہیں۔ یہاں کانٹ کا فلسفہ پوری سچائی کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ ''انسانی آرزوؤں اور اُمنگوں کا جواز موجود ہے اور فلسفے کے موضوع صرف دو ہیں اوپر تاروں بھرا آسمان اور انسان کے باطن میں قانون اخلاق۔''[۱۲] یہی باطن کا قانونِ اخلاق ہے جو زینت کی بھلائی کے لیے اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ زینت اُسے پسند بھی ہے پھر بھی وہ ایک نیا دھوکہ کھانے کو تیار ہے:

> ''میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار، بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔۔۔ اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہتا ہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔''(۱۳)

رنڈی کا کوٹھا بابو گوپی ناتھ کے ذہن کو سکون دیتا ہے کہ وہ یہاں کا عادی ہو گیا ہے۔ یہاں کی مٹی اُس کی مٹی سے میل کھاتی ہے۔ انسان گیلی مٹی سے بنا ہے جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جاتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ بھی پیدائشی تماش بین نہیں تھا، کوئی

بھی شخص پیدائشی طور پر اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ ہر شخص معصوم پیدا ہوتا ہے اُس کے ذہن کی خالی تختی پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وقت کے ساتھ اَن مٹ ہو جاتا ہے۔ ہمارے عقائد، عادات اس طرح راسخ ہوتی ہیں۔ بابو گوپی ناتھ بھی کہیں نو جوانی میں طوائف کے کوٹھے پر گیا تو پھر وہاں کی دنیا کا ہی باسی ہو گیا۔ لاہور کی کوئی مشہور طوائف ایسی نہ تھی جس کے کوٹھے تک بابو جی کی رسائی نہ ہوئی ہو۔ اب اس کی تماش بینی کی عادت یک دم بدلی اور یہ تبدیلی زینت سے بابو گوپی ناتھ کی محبت تھی کیونکہ محبت خدا سے ہو یا انسان سے، انسان کی کایا کلپ کر دیتی ہے اور اسی محبت نے بابو گوپی ناتھ کو زندگی کی حقیقت سے آشنا کر دیا تھا۔ یہ محبت خود غرض نہیں، ہوس پرست نہیں، استحصالی نہیں، ہمدردی سے بھرپور ہے۔ دونوں طرف ہی پوری فضا کے برعکس دو انسان انتہائی ہمدردی میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زینت، بابو گوپی ناتھ کی ہر بات مانتی ہے اور کسی اور کے ساتھ جانے میں اُس کی ہتک سمجھتی ہے جب کہ بابو کو زینت کے مستقبل کا فکر ہے کہ اُس کی دولت اب ختم ہونے والی ہے۔ وہ گیان کی اس منزل پر ہے جہاں اُسے اپنی نہیں ایک عورت کی فکر کھائے جا رہی ہے جس سے اُسے محبت ہے وہ اُسے دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ وہ دوسروں سے دھوکہ کھالیتا ہے مگر کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ یہ انسان کا بہت خوبصورت روپ ہے جو قحبہ خانوں کے راہب گوپی ناتھ کی شکل میں منٹو نے ہمیں دکھایا ہے کیونکہ گوپی ناتھ طوائف کے کوٹھے، رنگا رنگی دنیا اور اُس کے دھوکے سے حقیقت اور سراب کا فرق بہت واضح طور پر سمجھتا ہے۔ وہ دھوکے سے محبت نہیں بلکہ حقیقت سے محبت کرتا ہے اب طوائف کے کوٹھے پر دھوکہ ہی حقیقت ہے تو اس میں بابو گوپی ناتھ کا کیا قصور؟ اُس نے اسی دھوکہ کو حقیقت سمجھ کر نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اُسے اُسی دھوکہ سے محبت بھی ہو گئی ہے۔ بابو گوپی ناتھ کے ہاں فقیری اور رندی میں تضاد نہیں وہ انھیں ایک ہی سکے کے دو رُخ سمجھتا ہے۔ فقیری کی آخری حد رندی سے جاملتی ہے کہ دنیا کا سکہ گول ہے اور رندی جب رخ بدلتی ہے تو فقیری سامنے آجاتی ہے۔ بابو کے ہاں ہر چیز فریب ہے اور ہر فریب حقیقت کیونکہ اُس نے تمام عمر رنڈی کے دھوکے کو بھی حقیقت سمجھ کر قبول کیا ہے۔ وہ حقیقتوں کے سرابوں کا مسافر ہے۔ وہ سراب سے حقیقت کی طرف جانے کی بجائے حقیقتوں کے سراب میں سفر کرتا ہے کہ ہر حقیقت اب اُس کے نزدیک سراب ہی سراب ہے، بھلے وہ محبت ہو یا اعتقاد۔ اُسے پیر کا مزار بھی پسند ہے کیوں کہ یہاں بھی رنڈی کے کوٹھے کی طرح فرش سے چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہے اور بابو جی خود دھوکہ کھانے کے شائق ہیں۔ اُنھیں ان سرابوں سے محبت ہے لہٰذا اُن کے لیے جب تک دولت ہے رنڈی کا کوٹھا اور جب ختم ہو جائے گی تو پیر کا تکیہ موجود ہے اسی لیے وہ بے غم ہیں۔ دولت ختم ہونے کے قریب ہے مگر وہ اُسے سنبھال کر خرچ کرنے کی بجائے دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے۔ زینت کو موٹر بھی خرید دی ہے ڈرائیور بھی رکھ دیا ہے۔ ہر ایک کو منہ مانگی رقم بھی دے رہا ہے کیونکہ اُس نے دنیا کے اس سراب کی حقیقت کو پا لیا ہے۔ یہاں بابو گوپی ناتھ وحدت الوجود کی حقیقت تک پہنچا ہوا راہب محسوس ہوتا ہے جس کے لیے تمام دنیا ایک فریب ہے۔ عکس ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حقیقت مطلق تک نہ بھی پہنچے تو بھی آگہی کا شعور اور حقیقتِ ذات کا انکشاف واضح طور پر گوپی ناتھ کے کردار میں جھلکتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ اسی انکشاف کے ساتھ ایک گہری حقیقت بہت سادگی سے بیان کر جاتا ہے کہ ''کون نہیں جانتا رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔'' (۱۴)

بابو گوپی ناتھ نے کتنی بڑی حقیقت اور انسان کی سرشت صرف ایک جملے میں سمو دی ہے کہ والدین اپنی عزت، غیرت کا سودا کرتے ہیں اور اپنی ہی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔ والدین سے زیادہ اولاد کی عزت اور عصمت کا محافظ اور کون ہو سکتا ہے مگر یہاں تو بیٹی کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں کیوں؟ اس لیے کہ اُن لوگوں کا رزق اسی کے ساتھ بندھا ہے ایک دفعہ کنجر کا

لیبل لگ گیا تو پھر یہ معاشرہ کبھی باعزت زندگی گزارنے کا حق نہیں دیتا لہٰذا انسان اسی سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ یہی حال پیروں کے مزاروں کا ہے وہاں انسان خدا کا نام بیچتا ہے۔ سادہ لوح لوگوں کے اعتقاد کو دھوکہ دیتا ہے۔ صرف اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر۔ انسان اس پیٹ کے لیے کیا کیا نہیں کرتا، اپنا معبود اپنا خدا تک بیچ دیتا ہے۔ لالچ کے مارے انسان اپنا عقیدہ، اُس کی تعلیم ہر چیز بھول جاتے ہیں اگر یاد رہ جاتی ہے تو صرف دولت اور اُس کی ہوس جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ یہی سراب اور حقیقت کی آنکھ مچولی بابو کو پسند ہے اور وہ اسی دھوکہ بھری دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ اسی تماش بینی میں اپنی عمر گزارنا چاہتا ہے مگر اُس کا باطن اتنا روشن ہے کہ وہ زینت کو اس دھوکہ بھری دنیا سے پرے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ زینت کی شادی کے لیے کئی پاپڑ بیلتا ہے آخر کار سندھ کا ایک متمول زمیندار زینو کو پسند کر لیتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ زینو کو دو ہزار کے کپڑے، دو ہزار کے زیور اور پانچ ہزار نقد رقم دیتا ہے جو اُس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ شادی کی دعوت کا تمام اہتمام بھی گوپی ناتھ کرتا ہے چونکہ اُسے زینو سے محبت بھی ہے وہ سارا کام خود کرتا ہے، کھانے کے بعد لوگوں کے ہاتھ بھی دھلواتا ہے۔ منٹو زینت کے خاوند غلام حسین کے سامنے گوپی ناتھ کو ایک بٹیر کی طرح دکھاتا ہے مگر اُس کے اندر کے انسان کا قد بڑا ہے وہ منٹو کو دلہن دیکھنے کا کہتا ہے۔ منٹو پھولوں سے سجی مسہری دیکھ کر بے اختیار کہہ دیتا ہے کہ یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ زینت کے بے اختیار آنسو نکلتے ہیں مگر گوپی ناتھ اپنے تمام تر قد کے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور منٹو سے کہتا ہے کہ ''میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں۔۔۔ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔''(۱۵)

گوپی ناتھ کے اس ''کچھ'' کے پیچھے اُس کا سب کچھ نظر آجاتا ہے۔ وہ محبت، وہ ہمدردی، وہ انسانیت جو اُس کے خوبصورت دل میں تھی۔ اُس کی بھیگی آنکھیں، زینو کے لیے خوشی کی دعا، یہ سب انسان اُس منزل پر کرتا ہے جب وہ ذات کی حقیقت سے کائنات کی حقیقت کو پا لیتا ہے اور بابو گوپی ناتھ نے بھی اس منزل کو پا لیا تھا۔ وہ قحبہ خانوں میں رہتے ہوئے بھی حقیقت کی روشنی تک پہنچ گیا تھا جہاں عرفانِ ذات کے بعد انسان اپنا نہیں صرف دوسروں کی بہتری کا سوچتا ہے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے دُکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ خوف اور ڈر کی منزل سے آگے ہے، اُسے نہ فکرِ دنیا ہے اور نہ فکرِ آخرت۔ وہ تو صرف اپنے باطن کی روشنی میں زندگی کا سفر پورا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا کوئی دھرم نہیں، کوئی عقیدہ نہیں، صرف اور صرف انسانیت ہے، آدمیت ہے اور وہ جو بارگاہِ الٰہی میں مقبول تھا اور فرشتوں کا مسجود۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، بابو گوپی ناتھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ انسانی ذات کے نہاں خانوں سے دریافت ہونے والا ایک وجود ہے جو انسانی تہذیب کے گورکھ دھندوں میں گناہ اور آلودگی میں زندگی بسر کرتا ہوا یک لخت اپنے آپ کو منقلب کرتے ہوئے ایک نئی سائیکی اور ایک نئے وجود میں ظہور ہو جاتا ہے۔۔۔ اُس کی سائیکی میں کایہ کلپ کا عمل حیرت انگیز تھا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وہ کایا کلپ کی منزل تک اتنی تیزی سے کیوں کر پہنچ گیا تھا۔ قحبہ خانوں کے راہیوں کی زندگی قحبہ خانوں کے درو دیوار ہی میں گذرتی ہے اور کسی بھی تبدیلی کے بغیر بالآخر وہ قبر کی دیواروں یا آگ کے شعلوں میں اُتر جاتے ہیں۔''(۱۶)

یہ حقیقت ہے کہ بابو گوپی ناتھ منٹو کے تصورِ انسان کا پسندیدہ پرتو ہے۔ منٹو کو انسانوں میں نوری اور ناری دونوں ادائیں پسند ہیں وہ فرشتوں کی پاکیزگی کا قائل ہے مگر انسان کی جرأت گناہ بھی اُسے لبھاتی ہے کہ اسی جرأت گناہ نے انسان کو

فرشتوں سے ممتاز کیا۔ وہ انسان کو اُس کے عرفانِ ذات کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے جو شیطان کی طرف جھک تو سکتا ہے مگر شیطان بننا بھی چاہے تو اُس کی انسانیت دامن نہیں چھوڑتی۔ وہ انسان ہوتے ہوئے دوسروں کے احساسات کا خیال رکھتا ہے اور انسان رہتے ہوئے بھی فرشتوں کے تقدس تک پرواز کر لیتا ہے۔ غرض انسان کے اندر کی انسانیت تمام تر عیاشیوں کے باوجود بھی غائب نہیں ہوتی۔ کسی بھی لمحے میں لپک کر باہر آ جاتی ہے اور انسان کی کایا کلپ کر دیتی ہے۔ کچھ اس طرح کہ وہ خود بھی اُس کا کوئی جواز تلاش نہیں کر سکتا۔ منٹو کا گوپی ناتھ اُردو افسانے کے تصورِ انسان کا وہ پیکر ہے جو صدیوں کے عمل میں بھی زندہ رہتا ہے۔ منٹو کو اپنے کرداروں سے محبت ہے مگر گوپی ناتھ تو تمام مہارت اور تخیل کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ یہ کرداروں میں سب سے نمایاں اور جاندار کردار ہے۔ ورنہ منٹو کو اپنے کسی بھی کردار یا کسی بھی انسان سے نفرت نہیں، نہ ہی وہ نفرت کر سکتا ہے۔ خود منٹو کا کہنا ہے کہ
''میں نے اپنی عمر میں شاذ و نادر ہی کسی انسان سے نفرت کی ہے۔''(۱۷)

منٹو کو کسی کردار سے نہیں، انسان سے نہیں، اُس کی کچھ عادات ناپسندیدہ معلوم ہوتی ہیں جیسے راج کشور۔ غور کرنے پر راج کشور اور گوپی ناتھ ایک دوسرے کا تضاد معلوم ہوتے ہیں۔ راج کشور خوش شکل، صحت مند، کسرتی اور متناسب جسم کا مالک ہے جب کہ گوپی ناتھ ڈھلتی عمر، چھوٹے قد کے بظاہر غیر متناسب جسم کا مالک ہے۔ وہ پکا رند ہے جس کا ظاہری شرافت اور نیکی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جب کہ راج کشور کے لنگوٹ کے پکا ہونے کی گواہی ہر شخص دیتا ہے۔

وہ کھادی کے کپڑے پہنتا ہے۔ صحت مند اور تندرست ہے اور دوسروں کے سامنے اپنے متناسب اور سڈول جسم کی نمائش بھی کرنے سے نہیں چوکتا۔ ہمدرد ہے، ایکٹر ہونے کے باوجود لوگوں سے راہ و رسم رکھتا ہے۔ سیاست میں بھی دلچسپی ہے۔ اُس کے کریکٹر کی پاکیزگی کا بھی بہت شہرہ ہے۔ عام پبلک بھی جانتی ہے کہ وہ بہت بلند کردار کا مالک ہے۔ فلاحی کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ ماں باپ کا فرماں بردار ہے۔ غرض ہر ظاہری خوبی سے مزین یہ شخصیت منٹو کے دل و دماغ میں ریاکار کے طور پر اُبھرتی تھی۔ کیونکہ انسانوں کو اندر تک دیکھنے کا جو ملکہ اُسے حاصل تھا عام لوگ اُس صلاحیت سے عاری تھے۔

منٹو کو اُس کی ریاکاری سے عجیب نفرت تھی کہ وہ ہر ایکٹرس کو بہن کہہ کر پکارتا ہے اور وہ سب بھی اُسے بھائی کہتی ہیں مگر منٹو کا کہنا ہے کہ ''اگر تم کسی عورت سے جنسی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تو اس کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمھارے دل میں تمھاری بیوی کے سوا کسی اور عورت کا خیال داخل نہیں ہو سکتا تو اس کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت ہے۔''(۱۸)

منٹو نے جہاں راج کشور جیسا ریاکار دکھایا ہے وہیں اُس کا ایک اور دل پسند کردار 'صادق'' ہے۔ منٹو اُسے بابو گوپی ناتھ جو منٹو کا تخلیق کردہ بہترین کردار ہے کی صف میں ہی کھڑا کرتا ہے کہ اُسے ایسے لوگ قابلِ پرستش نظر آتے ہیں جو ریاکاری سے کوسوں دور اور خلوص و وفا کے پتلے ہیں۔ یہ انسان کا وہ روپ ہے جو واقعی انسان کہلانے کے حق دار ہیں کہ جن کا ظاہر اور باطن ایک ہے جو اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں اپنی خامیوں کا شمار دوسرے پر چھوڑنے کی بجائے خود ہی کر کے اپنے پیشے اور مزاج کے متعلق بھی کوئی غلط فہمی نہیں رکھتے۔

افسانہ ''نطفہ'' کا کردار خان بھی پر خلوص اور صاف گو کردار ہے۔ وہ اگر رنڈی سے تعلق قائم کرتا ہے تو اُس کے کوٹھے پر ہی ڈیرہ جما لیتا ہے۔ اُس سے محبت ہو جاتی ہے تو اُسے بیوی بنا لیتا ہے۔ صادق حیران ہے کہ خان اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباری اور سیاسی دنیا میں بھی اُس کا نام ہے۔ سرحد میں دو بیویاں بھی ہیں، صاحبِ اولاد بھی ہے مگر ایک رنڈی یعنی چچوڑی ہوئی ہڈی چوستا رہتا ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی رنڈی پر فدا ہے۔ صادق جب اُس سے رنڈی کے بارے میں پوچھتا ہے تو

خان مرد کی ازلی فطرت کو صرف ایک جملے میں بیان کرتا ہے:

''یہ رنڈی بہت اچھا ہے۔۔۔ہم سے محبت کرتا ہے۔۔۔جو عورت اُدھر ہوتا ہے محبت کرنا نہیں جانتا۔ نازنخرہ نہیں جانتا۔۔۔اور مجھے یقین آ جاتا ہے۔۔۔ مجھے اس کی ہر بات کا یقین آ جاتا ہے۔۔۔پھر گانا بجانا مفت۔۔۔عیاشی کی عیاشی، شادی کی شادی۔''(۱۹)

منٹو نے مرد کی فطرت کو کس طرح کھول دیا ہے کہ وہ عورت کو عورت نہیں صرف اپنے لیے کھلونا سمجھتا ہے۔ اُس کی محبت چاہتا ہے۔ اپنی عیاشی چاہتا ہے کہ مرد کو گھر کی عورت، اُس کی شرافت پسند نہیں۔ گھر کی عورت صرف اولاد اور سلسلہ نسب چلانے کو ہے جب کہ رنڈی دل بہلانے کو ہے۔ گھر والی عورت نازنخرہ، غمزہ وعشوہ نہیں جانتی۔ اُس کی ادائیں دل بہلانے کی نہیں اور تماش بین مرد یہی ادا چاہتے ہیں۔ اس کمی کو رنڈی کے کوٹھے پر یا اُس سے شادی کر کے پورا کر لیا جاتا ہے کہ مرد ازل سے عورت اور اُس کے حسن، اُس کی اداؤں کا غلام ہے۔ بظاہر تو طاقتور ہے مگر عورت کے سامنے اپنے جذبات کے ہاتھوں کمزور پڑ جاتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت ہی مرد کو سدھار لیتی ہے۔ بڑے بڑے سرکش مرد عورت کے دامِ الفت میں گرفتار ہو کر موم ہو جاتے ہیں جب کہ ہمارا معاشرہ اس حقیقت کو قبول کرنے سے یکسر منکر ہے۔ مرد اور عورت کی فطرت ازل سے وہی ہے مگر ظالم سماج کا انداز بھی نہیں بدلا۔ عورت خود مرد کے پیچھے نہیں آتی۔ مرد ہی عورت کے لیے کوٹھے پر جاتا ہے۔

صادق اور بابو گوپی ناتھ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ صادق خود اپنے پیشے یعنی ٹھیکے داری کے عیب گنتا ہے کہ وہ بھی اسی دو نمبر کام کو کرتے کرتے دو نمبری کا عادی ہو چکا ہے۔ مگر وہ اپنے دو نمبر کام کو چھپاتا نہیں سب کے سامنے اُسے تسلیم کرتا ہے۔ اُس کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد نہیں۔ اُس کا کہنا ہے:

''میں نے ساری عمر ٹھیکے داری کی ہے اور ٹھیکے داری سے بڑھ کر بے ایمانی کا اور کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اس کا اوّل کھوٹ اور اس کا آخر کھوٹ۔ یہ ایسا بازار ہے جس میں کوئی کھرا سکہ نہیں چل سکتا۔ سنا ہے ولایت میں ایسی مشینیں بنی ہیں جن میں اگر کھوٹے سکے ڈالے جائیں تو وہ باہر نکل آتے ہیں لیکن ٹھیکے داری ایک ایسی مشین ہے جس میں اگر کھرے سکے ڈالے جائیں تو قبول نہیں کرے گی فوراً باہر نکال دے گی۔۔۔ مجھے ساری عمر یہی کاروبار کرنا ہے کہ مجھے صرف یہی آتا ہے۔۔۔تو پھر کیوں نہ میں ہیرا منڈی میں اپنا گھر بناؤں۔ وہاں کھرے سکے چلتے ہیں لیکن اُن کے عوض بھی جو مال ملتا ہے اُس میں صرف کھوٹ ہی کھوٹ ہوتا ہے۔۔۔میں سمجھتا ہوں میری روحانی تسکین کے لیے وہاں کی فضا اچھی رہے گی۔''(۲۰)

منٹو نے روحانی تسکین کا لفظ استعمال کر کے انسان کی فطرت کا ایک اور رخ ہمارے سامنے کر دیا ہے کہ انسانی جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی اُن چیزوں کی عادی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر روحانی تسکین کا مطلب ایسی جگہ ہے جہاں باطن کی صفائی اور پاکیزگی کی جاتی ہے اور انسان کی روح کو اطمینان نصیب ہوتا ہے مگر منٹو نے انسان کی فطرت کے ڈھلنے کے عمل کو ایک ماہر کاریگر کی طرح دکھایا ہے۔ انسان تو گیلی مٹی سے بنا ہے، اُس کی فطرت میں ڈھلنے، ٹوٹنے، بکھرنے اور پھر نئی شکل میں جڑنے کی صلاحیت قدرت نے رکھی ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے روح بھی دھوکے کی اتنی عادی ہے کہ اب کھرا مال، شرافت، ہر چیز بے معنی ہو چکی ہے۔ یہاں معصوم انسان اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ کھوٹ کی فضا میں رہتے رہتے کھرے اور کھوٹے کے فرق

کو بے معنی سمجھتا ہے بلکہ کھرے مال سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں سارتر کا فلسفہ بے معنویت کھل کر سامنے آتا ہے کہ ایک مخصوص وقت میں ہر چیز اپنے معنی کھو دیتی ہے اور نئے معنی اختیار کر لیتی ہے۔

صادق خان کے پاس جب دولت زیادہ آ گئی تو وہ بھی اُسی راستے کا یعنی ہیرا منڈی کا انتھک مسافر بن گیا۔ پورا اوباش ہو گیا ایک نہیں کئی رنڈیوں کے پاس جاتا تھا اور تین برس تک اسی طرح کھل کر کھیلتا رہا یہاں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زیادہ دولت آ جائے تو عیاشی کی طرف انسان مائل ہو جاتا ہے۔ طالسطائے کے افسانہ انسان اور شیطان میں بھی شیطان انسان کی تباہی کے لیے زیادہ دولت تجویز کرتا ہے کہ دولت آئے گی تو خرابیاں خود بہ خود آ جائیں گی۔ خان کی دولت اور خرابات دیکھ کر راوی اُسے سمجھاتا ہے۔ باز رہنے کی تاکید کرتا ہے تو وہ انسان کی فطرتِ ثانیہ کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ اُسے دھوکہ کی دنیا میں رہنے کی عادت ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا خود دھوکہ اور سراب ہے۔ اُس کا کہنا ہے:

> ''میری دنیا کھوٹ کی دنیا ہے اس میں صرف ایک بٹا سو (۱/۱۰۰) حصہ سیمنٹ کا ہے باقی سب ریت۔۔۔ اور وہ بھی جس میں آدھی مٹی ہوتی ہے۔ میرے ٹھیکہ میں جو عمارت بنتی ہے اُس کی عمر کاغذ پر پچاس سال ہے تو زمین پر دس سال ہوتی ہے۔۔۔ میں اپنے لیے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں۔۔۔ رنڈیاں ٹھیک ہیں۔۔۔ میں نے سوسائٹی کے اس ملبے کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہر روز ایک نہ ایک بوری ڈھو کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔'' (۲۱)

صادق وہ کردار ہے جو بظاہر بدنام زمانہ ہے۔ چھٹا ہوا رند ہے مگر اُس میں اتنی انسانیت باقی ہے کہ وہ معاشرے کی ایک بُرائی کی ذمہ داری تو قبول کرتا ہے اور یہ اعتراف کسی نہ کسی کو تو کرنا ہی تھا۔ نام نہاد اشرافیہ کی اس سوسائٹی کا گند کسی نہ کسی کو تو صاف کرنا ہے جہاں اتنی ٹھیکیداری اور منافع وہاں ایک گھاٹے کا سودا بھی بُرا نہیں کہ انسان کا کاروبار صرف نفع ہی نہیں بلکہ نفع نقصان پر ہے۔ یہاں منٹو صادق کے کردار کا ایک اور رخ ہمارے سامنے لے آتا ہے کہ کوئی انسان اتنی باریکی اور گہرائی تک کسی دوسرے انسان کے اندر بھی دیکھ سکتا ہے ورنہ تو عام طور پر انسان اپنے اندر کی گہرائی سے بھی ناواقف رہتا ہے مگر صادق جیسے انسان جو کسی اور ہی دنیا کے باسی معلوم ہوتے ہیں، نہ رند ہیں نہ فرشتے، ہر لحاظ سے انسان ہیں جو اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہے بظاہر برائی نظر آنے کے باوجود اچھائی اور نیکی اپنا غلبہ کر لیتی ہے کہ نیکی طاقتور ہے۔ صادق جس رنڈی کے ہاں ٹھہرتا ہے۔ وہ حاملہ ہو جاتی ہے اب صادق کا نوری پہلو ہمارے سامنے پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ وہ اُس رنڈی سے شادی کر لیتا ہے۔ ہزاروں روپے دے کر شادی کرتا ہے کہ اُس کے نطفے پر اُسی کا نام ہوگا، اپنا گناہ کسی اور کے سر تھوپنے کی کیا ضرورت ہے۔ منٹو کا کردار صادق، منٹو کے ان الفاظ کی تائید کرتا ہے کہ:

> ''زمین کسی کی کیسی بھی ہو، مگر بیج تو آپ ہی کا ہوگا۔ زمین کا پٹہ آپ کے پاس نہیں تھا، نہ ہی کوئی عذر، آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فلاں رنڈی جس کے بطن سے آپ کے خون کا قطرہ لڑکی یا لڑکا بن کر پیدا ہوا ہے آپ کی اولاد نہیں۔ اس کی تخلیق و تولید کی ذمہ داری یکسر آپ کی ہے۔ آپ اس کے وجود سے منحرف نہیں ہو سکتے۔'' (۲۲)

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ رنڈیوں کی اولاد اور کوٹھے سب شرفا کے دم سے آباد ہیں مگر کوئی شریف اُنھیں قبول نہیں کرتا، نہ ہی ولدیت کے خانے میں کسی کا نام ہوتا ہے مگر یہاں صادق کا روشن باطن سامنے آتا ہے وہ رنڈی سے شادی کرتا

ہے جب لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ چھ ماہ بعد رنڈی کو طلاق دے کر سمجھا تا ہے کہ:

> ''تمھارا اصل مقام یہ گھر نہیں۔ ہیرا منڈی ہے۔۔۔ جاؤ اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کو شریف بنا کر میں تم لوگوں کے کاروبار پر ظلم نہیں کرنا چاہتا، میں خود کاروباری آدمی ہوں، یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جاؤ خدا میرے اس نطفے کے بھاگ اچھے کرے لیکن دیکھو اسے نصیحت دیتی رہنا کہ کسی سے شادی کی غلطی کبھی نہ کرے۔۔۔ یہ غلط چیز ہے۔''(۲۳)

صادق کاروباری آدمی ہے۔ وہ کاروباری نکتے سمجھتا ہے کہ رنڈی کا کاروبار لڑکی سے چلتا ہے وہاں لڑکی کی پیدائش پر ہی خوشی منائی جاتی ہے مگر یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ رنڈی کا کاروبار اُس کا پیشہ ہے۔ رنڈی عورت ہے، عورت پن اُس کی پہلی حقیقت اور پیشہ اُس کی ضرورت ہے، ہر عورت میں اُس کا اصل اور حالات کا جبر یا مہر شامل ہے۔ حالات اُس کو ایک دفعہ اس بازار میں لے آئے تو پھر واپسی کے تمام رستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ معاشرہ رنڈی کو عورت کی حیثیت دینے پر راضی نہیں۔ رنڈی کی اولاد کے ساتھ بھی ماں کا پیشہ کلنک کا ٹیکہ بن کر چلتا ہے اور بظاہر شرفا میں رنڈی کی شادی شاذ و نادر ہی کامیاب ہوتی ہے کہ معاشرہ ماں کی غلطی بیٹی کے سر منڈھ دیتا ہے اور رنڈی کی بیٹی شرافت سے زندگی گزارنا بھی چاہے تو معاشرہ اُسے جینے نہیں دیتا۔ اسی پہلو کو صادق واضح کرتا ہے کہ کبھی یہ غلطی نہ کرنا کہ کسی کے ساتھ شادی کرو۔ منٹو نے صادق کا کردار اسمِ بامسمیٰ دکھایا ہے کہ وہ جو سچ سمجھتا ہے اُسے بیان کرنے میں جھجکتا نہیں اور سچائی کا کھل کر اظہار کرتا ہے کہ انسان سچا اور کھرا ہے۔ جب وہ اپنی اصل کو پا لیتا ہے، جب اپنی ذات تک معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر دھیان سے گیان کی منزل تک جاتا ہے مگر عام صوفیوں کی طرح یہ سلوک کی منازل طے نہیں کرتے۔ ان انسانوں پر ایک لمحے میں اپنی ذات اور کائنات کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

> ''انسانی اچھائی ایک ایسی چیز ہے جس کا اخلاقیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ صادق کی انسانیت زندہ ہے مگر مروجہ اخلاقیات سے بالاتر ہے۔ وہ معاشرے کا چھٹا ہوا رند ہے، ہیرا منڈی ہی کو گھر سمجھتا ہے اس کے باوجود اُس کا عمل اُس کی بنیادی انسانیت کی گواہی دیتا ہے۔ ہیرا منڈی میں رہنے کے باوجود اُس کی روح آلودہ نہیں ہوئی۔ مروجہ سماجی اخلاقیات میں انسان خود کو نیک ہونے کا فریب دیتا ہے اور پورا سماجی نظام عیاری اور سمجھوتہ پر چلتا ہے۔''(۲۴)

شیطان کو شرمانے والا ایک کردار منٹو کے ''صاحبِ کرامات'' کا ہے۔ صاحبِ کرامات میں چوھدری موجو کے روپ میں منٹو نے اس سادہ لوحی کو دکھایا ہے جو عام مذہبی آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔ منٹو نے ہماری سادہ لوحی کو عیاں کیا ہے کہ ہم نے اپنا اور خدا کا معاملہ ان مذہبی رہنماؤں کے سپرد کر دیا ہے۔ اُس کے احکام کیا ہیں اور بندوں کے حقوق کیا ہیں؟ خدا کیا ہے اور انسان کا مقصدِ تخلیق کیا؟ یہ سوال عام انسانوں کے ذہن کے قریب بھی نہیں پھٹکتے حالانکہ قرآن نے تو تدبر اور تفکر کا حکم دیا ہے۔ کسی کے مرنے پر دعا کے لیے بھی سادہ لوح انسان اپنے تصور اور خدا کے مطابق یہ دعا کرتے ہیں کہ ''خدا کرے اُس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے۔''(۲۵) یعنی ہمارا ہر عمل، ہمارے کھانے پینے اور جنس کے گرد گھومتا ہے اس سے بڑھ کر کچھ سوچنا ان

لوگوں کے لیے مشکل ہے۔ منٹو نے ہمارے اندازِ نظر پر گہرا طنز کیا ہے کہ یہ انسان عیّاروں کے ہاتھ اسی لیے لٹتے ہیں کہ طلاق دیتے وقت بھی صرف تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دو تو طلاق ہو جاتی ہے عورت کا کوئی حق نہیں۔ طلاق کا طریقہ کار کیا ہے یہ اُن کی عقل سے بالاتر ہے یعنی یہ وہ انسان ہیں جو بعد میں پچھتاتے ہیں لیکن نکلا ہوا تیر کمان میں واپس نہیں آتا۔ ایسا ہی ایک سادہ لوح کردار چوہدری موجو کا ہے جو غصے میں اپنی بیوی پھاتاں کو طلاق دے دیتا ہے مگر اب اکیلا اپنی بیٹی جیناں کے ساتھ رہتا ہے۔ اُسے اپنے کیے کا پچھتاوا ہے مگر اب بے بس ہے انھی سوچوں میں گم ہے کہ ایک دراز ریش بزرگ، سرمہ لگی آنکھیں، لمبے لمبے پٹے، سر پر سفید عمامہ، کاندھے پر ریشم کا کاڑھا ہوا ریشمی رومال، ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا عصا، پاؤں میں لال کھال کا نرم و نازک جوتا کہ سراپا دیکھ کر ہی دل میں احترام پیدا ہو جائے۔ چوہدری موجو سادگی سے اُٹھتا ہے اور پوچھتا ہے آپ کہاں سے آئے؟ کب آئے؟ بزرگ کی کتری ہوئی لبوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی:

> ''فقیر کہاں سے آئیں گے اُن کا کوئی گھر نہیں ہوتا، اُن کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا، اُن کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں، اللہ تبارک تعالیٰ نے جدھر حکم دیا چل پڑے، جہاں ٹھہرنے کا حکم ہوا وہیں ٹھہر گئے۔'' (۲۶)

چوہدری موجو عقیدت سے اُن کا ہاتھ چومتا ہے آنکھوں سے لگتا ہے کہ اُس کا گھر اُن کا ہی گھر ہے۔ بزرگ نے چوہدری کی سادگی کو جان لیا ہے کہ عقیدت اندھی ہوتی ہے اور انسان کو کچھ نظر نہیں آتا ہے لہٰذا مولوی صاحب خدا کا نام لے کر خدا کے بندے کو دھوکہ دینا شروع کرتے ہیں کہ خدا کو پتہ نہیں میری کونسی ادا پسند آئی ہے جو اس حقیر اور عاصی کو تیرے پاس بھیج دیا۔ موجو چونکہ خود اپنے گنہگار ہونے کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اب اپنے سے بہتر اور خدا کے بھیجے ہوئے نیک بندے کو دیکھ کر اُس کا احساسِ گناہ دوچند ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہم جیسے گناہ گاروں کو بخشنا اور بخشوانا آپ کا کام ہے کہ مولوی صاحب تو خدا کے حکم سے آتے ہیں۔ آئے اُس کے حکم سے ہیں کہ اُس کے بندوں کے کام آئیں کیونکہ اُنھوں نے خدا کی عبادت میں چالیس سال گزارے ہیں۔ عبادت کے اس رُعب سے بیچارہ موجو اور دب جاتا ہے اور اپنی دین اور دنیا دونوں اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ جوان جینا کو دیکھ کر مولوی صاحب کی نیت بدل جاتی ہے۔ اب وہ باپ کے سامنے بیٹی کو کہتے ہیں کہ ہم فقیروں سے کیا پردہ اور موجو اُن کی بزرگی کا معترف ہے۔ فوراً کہتا ہے کہ کوئی پردہ نہیں مولوی صاحب سے پردہ کیسا ہوگا، یہ مولوی صاحب ہیں اللہ کے خاص بندے، ان سے پردہ کیسا گھونگٹ اٹھا لے اپنا'' (۲۷) جب کہ نامحرم سے پردہ تو دین کا حکم اور چوہدری تو خدا کی رحمت سمجھ کر اس بزرگ پر اپنا اور گھر کا ہر دروازہ کھول دیتا ہے کہ ان سے کیا پردہ۔ جیناں کی جوانی اور گھر میں دوسری عورت کا نہ ہونا، مولوی اپنے شاطرانہ ذہن سے جیناں کی والدہ کے مرنے کا جھوٹ بھی سمجھ جاتا ہے۔ موجو جیسا معصوم اس کو کرامت سمجھ لیتا ہے اور صاف بتا دیتا ہے کہ میں نے اُسے طلاق دے دی تھی مگر اب پچھتاتا ہوں۔ جیناں کھانا لے کر آتی ہے تو مولوی صاحب اُسے پاس بٹھاتے ہیں جب کہ وہ زمین پر بیٹھنا چاہتی ہے۔ جیناں جوان ہے مرد کی نظر سمجھتی ہے مگر مولوی صاحب کھانا کھلانے کا کہتے ہیں اُس کی پتلی کمر مولوی کی آنکھ میں کھٹکتی ہے مگر ساتھ ہی شیطانی منصوبہ بھی چل رہا ہے۔ کھانے سے پہلے موجو ہاتھ دھلاتا ہے بعد میں یہ سعادت جیناں کو نصیب ہوتی ہے وہ کن انکھیوں سے جیناں کی ڈھلکی ہوئی چدریا کی طرف دیکھتے رہتے ہیں موجو بھوکا رہ کر مولوی کا پیٹ بھرتا ہے۔ یہاں پریم چند کا ''سوا سیر گیہوں'' اور اُس کے مہاتما جی یاد آ جاتے ہیں۔ گویا مذہب کوئی بھی ہو، انسان کی ریا کاری مذہب کی آڑ میں دوسرے انسان کا استحصال کرتی ہے۔ خود بھوکا رہ کر بھگوان یا خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے

جیسے انسانوں کی پوجا، خدا کے خوف کا حتمی نتیجہ ہے۔ انسان ایک خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوسرا سہارا ڈھونڈتا ہے مگر جس کو بھی خدا یا بھگوان کا درجہ دو وہ خود کو سچ مچ کا خدا سمجھ لیتا ہے۔ گویا مذہب کا کوئی فرق نہیں جو استحصال مہاتما جی نے کیا وہی مولوی صاحب کر رہے ہیں مگر یہ بہت پہنچے ہوئے اور بقول منٹو کے ''صاحبِ کرامات'' ہیں ان لوگوں کو خدا بنانے میں ہمارے سادہ لوح لوگوں کی جہالت اور تعصب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ منٹو ان شیطان صفت کرداروں کے مکروہ چہرے کچھ اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ ریا کاری کا ایک ایک تار اپنے موئے قلم سے توڑ دیتا ہے۔ حمایت علی شاعر، منٹو کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے اُس دور کے چلتے پھرتے کردار اور اُن کے رویے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ کرداروں کے مکروہ چہرے جنھیں ہم پارسا سمجھتے تھے عیاں ہو جاتے ہیں اور کچھ وہ لوگ جنھیں ہم قابلِ نفرت سمجھ کر تحقیر سے کام لیتے ہیں وہ عظیم انسان نکلتے ہیں۔ ایک انسان ہی اس معاشرے کا واحد رہائشی ہے جو چہرے پر چہرہ لگا کر مختلف روپ دھار لیتا ہے، کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور کسی کے ساتھ فراڈ کرتا ہے، کسی کا مال لوٹ لیتا ہے تو کسی کی عصمت دری کر جاتا ہے۔ اُس کی یہ بناوٹ اس لیے ہے کہ وہ بھولے بھالے، سیدھے سادھے اور معصوم لوگوں کو اپنی ہوس اور چالا کی کا شکار کرتا ہے۔ کبھی کسی جانور نے ایسا نہیں کیا۔ کیا انسان جانور کے درجے سے بھی گر گیا ہے۔''(۲۸)

موجو خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے مولوی کی شکل میں فرشتہ رحمت بھیجا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ فرشتہ ابلیس ہے جو راندۂ درگاہ ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور انھی کمزوریوں کا فائدہ مذہبی ریا کار اُٹھاتے ہیں۔ انسان کے گناہوں پر پردہ ڈالنے اور بخشوانے کی ذمہ داری ان کی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا محور انسانی زندگی اور اُس کا سدھار ہے۔ کہیں وہ انسانی جذبات کی تہذیب کرتا ہے تو کہیں زندگی کی کمزوریوں اور خامیوں کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔ زندگی میں بے راہ روی جہاں بھی اُسے نظر آئے، جہاں کسی کجی پر اُس کی نظر پڑے کیوں کہ افسانہ نگار کے جذبات کو جب ٹھیس لگتی ہے جب کوئی مکروہ منظر اُس کی نظر سے گزرتا ہے تو اُس کا تخیل حرکت میں آ جاتا ہے اور انسانی زندگی کے یہ روپ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جن کی طرف عام انسان کی نظر بھی نہیں جاتی مگر منٹو کی نظر میں تو گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

منٹو نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سماج میں انسانوں کے جو مختلف روپ دیکھے ہیں اُس نے ان کی نقل نہیں کی بلکہ فنکارانہ چابکدستی سے ہماری توجہ اُن کی طرف مبذول کروائی ہے کہ دیکھو یہ بھی انسان کا ہی ایک روپ ہے۔ منٹو کو انسانوں میں حیوانیت نظر آ جاتی ہے۔ وہ حیوان سے نہیں انسان سے سروکار رکھتا ہے۔ اُسے تو انسانوں کو ٹٹولنے، اُن کے اندر کے حیوان کو منظرِ عام پر لانے کا مرض لاحق تھا کہ وہ انسانوں میں انسانیت کو تلاش کرتا تھا، انسانیت کو باہر لانا چاہتا تھا۔ منٹو نے اُن انسانوں کی خصوصیات کو تخیل کی قوت سے مختلف کرداروں کا روپ دیا تا کہ ماحول سے یگانگت پیدا کر کے ان کج رَو انسانوں کی طرف معاشرے کی توجہ کو منعطف کیا جا سکے۔ کیونکہ صحت مند ادب اپنے عہد کی برائیوں یا صرف اچھائیوں کا مرقع نہیں ہوتا کہ خیر اور شر، سیاہ اور سفید طاقتیں یکساں حرکت میں ہیں۔ فنکار کا کام ان کے کارنامے سامنے لانے کا ہے اور منٹو نے ان فرشتوں اور شیطانوں کے کارنامے بے نقاب کر دیے ہیں بھلے وہ مذہب کی آڑ ہو یا معاشرتی وقار، اُس کے قلم سے ہر دیوار لرزہ براندام رہی۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد انصاری، محشر خیال، مرتب: پروفیسر منظور حسین، لاہور: آئینہ ادب، بارِسوم، ۱۹۷۱ء، ص:۵۰

۲۔ منٹو، سعادت حسن، سرکنڈوں کے پیچھے، کلیات منٹو(افسانے)، جلد دوم، اسلام آباد، نریٹوز، ۲۰۱۲ء، ص:۵۰۳

۳۔ ایضاً، ص:۵۰۷

۴۔ غلام زہرا، مرتب: منٹو کیا تھا، لاہور: برائٹ بکس، ۲۰۰۳ء، ص:۲۲۔۱۲۱

۵۔ منٹو، سعادت حسن، یزید، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۱ء، ص:۱۳۷

۶۔ ایضاً، ص:۱۹۹

۷۔ غلام زہرا، مرتب، منٹو کیا تھا، ص:۲۸۰

۸۔ ایضاً، منٹو، چغد، ص:۴۳۴

۹۔ ایضاً، ص:۴۳۸

۱۰۔ منٹو، سعادت حسن، کلیاتِ منٹو، چغد، مرتب: امجد طفیل، ص:۴۴۱

۱۱۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جدید، ۲۰۰۲ء، ص:۲۱۱

۱۲۔ علی عباس جلال پوری، روایاتِ فلسفہ، لاہور: منظور پرنٹنگ پریس، بارِ چہارم، ۱۹۹۹ء، ص:۶۷

۱۳۔ منٹو، سعادت حسن، کلیاتِ منٹو، چغد، مرتب: امجد طفیل، ص:۴۳۸

۱۴۔ ایضاً، ص:۴۳۸

۱۵۔ ایضاً، ص:۴۴۴

۱۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، بابو گوپی ناتھ قحبہ خانوں کا راہب (غیر مطبوعہ)، ص:۱

۱۷۔ منٹو، سعادت حسن، کلیاتِ منٹو، چغد، مرتب: امجد طفیل، ص:۴۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص:۴۴۸

۱۹۔ منٹو، سعادت حسن، سڑک کنارے، ص:۶۹

۲۰۔ ایضاً، ص:۷۳۔۷۲

۲۱۔ ایضاً، ص:۷۶۔۷۵

۲۲۔ منٹو، سعادت حسن، منٹو کے مضامین، ص:۳۰۶

۲۳۔ منٹو، سعادت حسن، سڑک کنارے، ص:۷۷

۲۴۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، ص:۱۶۰

۲۵۔ منٹو، سعادت حسن، سڑک کنارے، ص:۱۷۸

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۸۰

۲۷۔ ایضاً، ص:۱۲۸

۲۸۔ حمایت علی شاعر، منٹو کے متنازع افسانے، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، س ن، ص:۱۲۔۱۱